غالب اور مومن تغزل کی روشنی میں

(جناب مظفر شاہ خاں صاحب، ایم - اے)

غالب اور مومن معاصرین کی حیثیت سے ایک ہی دور ادب کے پروردہ ہیں لیکن دونوں کے تخیل کی رنگینیاں الگ الگ ہیں - غالب اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں رنگ بیدل کے اتباع میں، ندرت تخیل، اور شکوہ الفاظ کی فکر میں اس طرح کھو گئے تھے کہ ان کے کلام میں واردات محبت اور جذبات نگاری جیسی اہم خصوصیات کے پہلو نمایاں نہ ہوسکے -

قتل عشاق اور رقص بسمل ایک پامال موضوع ہے، غالب نے اپنے ندرت تخیل سے بہت حد تک ایک نئے اسلوب میں پیش کیا، اور اس میں انھیں کامیابی بھی ہوئی، پھر بھی وہ جذبات اور وجدانیات کو متاثر نہ کرسکے، اس خیال کو اس طرح پیش کرتے ہیں ؎

جاں دادگاں کا حوصلہ فرصت گداز ہے　　یاں عرصۂ تپیدن بسمل نہیں رہا

عشرت قتل گہِ اہل تمنا مت پوچھ　　عید نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

ابھی ہم قتل گہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں　　نہیں دیکھا شناور جوئے خوں میں تیرے توسن کو

غالب ایک قنوطی شاعر تھے، ان پر یاسیت اس قدر غالب تھی کہ تمام عمر جگر کاوی اور ماتم کاری میں ہی گذری، ان کے ماحول پر عسرت و تنگدستی اس قدر چھائی ہوئی تھی کہ ان کے جذبات اسی رنگ میں رنگے ہوئے اشعار کی صورت میں ان کی زبان سے نکلتے تھے،

یہ بات مانی ہوئی ہے کہ میر کے بعد غالب اردو شاعری میں یاسیت اور قنوطیت کے امام سمجھے جاتے ہیں جس طرح فانی عصر حاضر میں -

یہ قنوطیت ان کی شاعری میں ہی نہیں بلکہ ان کی نثر میں بھی نمایاں ہے، جس کا باعث ان کے ماحول کی تباہ کاریاں تھیں۔ جسے غالب ہمیشہ "رستخیز بیجا" سے تعبیر کیا کرتے تھے اور جس نے ان کو یاس و حسرت کا مجسمہ بنا دیا تھا ؎

خوشی کیا کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آوے — سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابھی سے برق خرمن کو
نہ لٹتا دن کو، تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا — رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو
قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں — موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

غرض اس قسم کے سیکڑوں شعر غالب کے یہاں موجود ہیں۔ جنہیں پڑھ کر غالب کے مصائب اور دکھ درد کا احساس ہونے لگتا ہے اور ان کی زندگی کا قنوطی پہلو نمایاں ہو جاتا ہے۔

دوسری اہم خصوصیت اور رجحان جس نے غالب کے تغزل کے اس پہلو کو ابھرنے نہیں دیا وہ ان کا رشک ہے۔ جس میں شعری کیف اور اثر آفرینی کھو گئی ہے ان کے رشک کی حدیں یہاں تک وسعت خواہ ہیں کہ ان کو یہ کہنے میں بھی باک نہیں ؎

قیامت ہے ہوا ہے مدعی کا ہم سفر غالبؔ — وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے
کیوں جل گیا کہ آب رخ یار دیکھ کر — جلتا ہوں اپنی طاقت دیدار دیکھ کر
چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں — ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں
میں مضطرب ہوں وصل میں خوف رقیب سے — ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں

ان مثالوں سے ظاہر ہے کہ غالب کے یہاں تغزل تو ہے لیکن ان کے تغزل میں ان کی ندرت تخیل، طرز ادا اور اسلوب بیان نے جو مشکل پسندی کے خصائص جمع کر دیے تھے انہوں نے تغزل کی ان کیفیتوں کو، جنہیں جان تغزل کہا جاتا ہے اور سوز و اثر جس کے لازمی نتیجے ہیں، ان کے کلام میں پیدا نہیں ہونے دیا، اگرچہ ان کی ان چند سادہ اور صاف غزلوں میں یہ وصف بھی موجود ہے جو انھوں

نے رنگ بیدل کو ترک کرنے کے بعد کہی ہیں۔ مثلاً

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے　　آخر اس درد کی دوا کیا ہے

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت غم سے وہ بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں رلائے کیوں

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں　　خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہوگئیں

حقیقت یہ ہے کہ ان کی نازک خیالی اور بلند پروازی کی تاب عاشقانہ شاعری نہ لاسکی اسی باعث ان کا کلام ان کے معاصرین مومن اور ذوق کے مقابلہ میں فروغ نہ پا سکا۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی چیز ان کے کلام کی بے سوزی و بے کیفی ہے خود مرزا اس حقیقت سے آگاہ تھے چنانچہ اپنے کلام کی عدم مقبولیت کا الزام زمانہ کی ناا ہلیت کے سر رکھ کر انھوں نے بار بار اس کا اعادہ کیا ہے ؎

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پرواہ　　نہ سہی گر مرے اشعار میں معنی نہ سہی

بر روئے شش جہت در آئینہ باز ہے　　یاں امتیاز ناقص و کامل نہیں رہا

کبھی اپنے فارسی کلام کو پشت پناہ بنا کر کہتے ہیں ؎

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ　　بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من ست

اس خصوص میں جہاں تک غور کیا جاتا ہے کچھ مرزا ہی کی طرف سے بے پروائی برتی گئی اس لئے ان کی جدت پسندی مذاق عامہ کا ساتھ نہ دے سکی اس ماحول کی طبائع ذوق کی سادگی و روانی، محاورہ اور روز مرہ سے آراستہ شاعری کو پسند کرتی تھیں، ان کو مومن کا کیف آفریں، روح کی گہرائیوں تک اتر جانے والا تغزل مطلوب تھا، جس میں معاملہ بندی کے ایسے حسن کارانہ اسباب موجود ہوں جن کو سوقیت سے کوئی رابطہ نہ ہو

مومن کے یہاں نازک خیالی کے باوجود ان کا تغزل، ندرت تخیل نادر اور دور از کار تشبیہات

کے پردوں میں چھپا ہوا نہیں ہے ان کے یہاں واردات وجذبات ایک انوکھی طرز ادا کے ساتھ موجود ہیں۔ مومن کے اسلوب بیان میں ایک خاص وصف یہ ہے کہ وہ بیان کا ایک ٹکڑا چھوڑ جاتے ہیں جس کو پڑھنے والا خود اپنی طرف سے اس کے معنی کے لئے ضم کر لیتا ہے جس کے باعث لطف کلام میں ایک خاص چاشنی پیدا ہو جاتی ہے۔ یوں تو مومن خاں کا تغزل، کیا طرز ادا اور کیا اسلوب بیان دونوں حیثیتوں سے اس بلندی پر ہے جسے غالب کی ندرت تخیل اور بلند پروازی بھی نہ دبا سکی اور ان کے بیان کی شوخی اس کی لذت کو پھیکا کر سکی مگر ان کے تغزل کا نمایاں وصف اور اہم پہلو ان کی معاملہ بندی ہے جو جان تغزل ہے یہ وہ دشوار گذار مرحلہ ہے کہ اس راہ میں ایک ہلکی سی لغزش کلام کو متانت اور سنجیدگی سے گرا دیتی ہے۔ ہماری شاعری میں جرأت کی معاملہ بندی مشہور ہے۔ لیکن وہ ان کے طرز ادا اور ان کے علمی افلاس کے باعث سراسر سوقیت بن کر رہ گئی ہے۔ خود مرزا غالب سلامتی فہم کے باوجود جب اس راستہ سے گذرے ہیں اور جب انھوں نے اس نغمہ تغزل کو اپنے مضراب تخیل سے چھیڑا ہے تو وہ بھی "خارج پردہ" ہو کر رہ گئے ہیں ؎

بوسہ دیتے ہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ — جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو — دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کئے

غرض کہ اس قسم کے سیکڑوں شعر غالب جیسے دقیقہ سنج اور نازک خیال شاعر کے یہاں موجود ہیں جن میں ایک ذرا سی بے اعتدالی نے سوقیت پیدا کر دی ہے۔

مگر یہی دشوار گذار مرحلہ مومن کی شاعری کی جان ہے اور ان کا عظیم ترین سرمایۂ فکر، اس معاملہ بندی کو مومن نے اپنے نازک خیال سے اس قدر لطیف اور پر کیف بنا دیا ہے کہ آج تک اس کی لطافت باقی ہے ؎

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے — ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا　　جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
اس نے کیا جانے کیا کیا لے کر　　دل کسی کام کا نہیں ہوتا

ایک دوسری غزل کے چند شعر سُنئے ؎

میرے تغیرِ رنگ کو مت دیکھ　　تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے
غیر سے بے حجاب ملتے ہو　　شب عاشق سحر نہ ہو جائے
مومن ایماں قبول دل سے مجھے!　　وہ بتِ آزردہ گر نہ ہو جائے

اور سنئے ؎

کہتے ہو تم کہ ہوش نہیں اضطراب میں　　سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں
تقدیر ہی بُری، مری تقدیر ہی بری　　بگڑے جو پرسش سببِ اجتناب میں
پیہم سجود پائے صنم پر دمِ وداع　　مومن خدا کو بھول گئے اضطراب میں

غزل کے حقیقی خدوخال، جذباتِ محبت، وارداتِ عشق اور وہ معاملات جو اس راہ میں ہر وقت بلاکشانِ محبت کو پیش آتے رہتے ہیں، اب ان کو اپنی جولانیِ طبع سے اگر وسعت دے کر تصوف واخلاقیات کے مباحث کا سرمایہ دار بنا دیا جائے تو تغزل کے حقیقی اعتبار سے ان اوصاف اور ان وسعتوں کو تغزل یا عشقیہ شاعری کے تحت میں جگہ دینا اور کمالِ فن کی دلیل گردانتا ارجمندی یا خوش فہمی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی - آج مرزا غالب کے تغزل اور ان کی رفعتِ تخیل سے مرعوب ہو کر خواہ ڈاکٹر بجنوری کی طرح غالب کی شاعری اور دیوان کو ہندوستان کی الہامی کتاب کہہ دیا جائے لیکن اربابِ نظر جانتے ہیں کہ مدحیہ الفاظ کی بلند آہنگیاں حقیقت پر پردہ نہیں ڈال سکتیں خود ڈاکٹر بجنوری نے محاسن کلامِ غالب میں غالب کے منتخب اشعار کو بعض اہم فلسفیانہ مباحث کے ساتھ منطبق کیا ہے لیکن ان اشعار میں بھی زیادہ وہ شعر وہی ہیں جن میں تغزل کی روح کا فقدان ہے بلکہ وہ صرف عالمانہ

اخلاق یا حکمیہ خیالات ہیں،

یہاں یہ مدعا نہیں کہ غالبؔ کے تغزل کا سرے سے انکار کیا جائے بلکہ صرف یہ دکھانا ہے کہ غالبؔ کے تغزل میں تغزل کی اصل روح موجود نہیں ہے اور جہاں کہیں انھوں نے اس کیف کو تخلیق کیا ہے وہاں وہ یا تو سوقیت پر آ گئے ہیں یا بلند پروازی کی فضاؤں میں ان کے پر و بال الجھ کر رہ گئے ہیں، اور وہ کیف بھی کھو بیٹھے جو اس سوقیت میں تھا،

لیجئے اب غالبؔ کے وہ اعلیٰ اشعار بھی سنئے جو ان کے تغزل کے شاہکار یا جواہر ریزے سمجھے جاتے ہیں ؎

تھی وہ اک شخص کے تصور سے ۔۔۔ اب وہ رعنائی خیال کہاں
ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق ۔۔۔ لرزے ہے موج مے تری رفتار دیکھ کر
ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا ۔۔۔ بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا
دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز ۔۔۔ پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا
نگاہ بے محابا چاہتا ہوں ۔۔۔ تغافل ہائے تمکیں آزما کیا

ان اشعار کے مقابلہ میں مومنؔ کی معاملہ بندی اور نزاکت تخیل، اسلوب بیان اور ندرت ادا ہے جس نے ان کے سارے دیوان کو جانِ تغزل بنا دیا ہے، مومنؔ کی ایک مرصع غزل کے چند اشعار سنئے ؎

خار و خس میں گلشن کے بوئے گل جو آتی ہے ۔۔۔ رشک سے کیا برباد آشیاں اپنا
روز کا بگاڑ آخر جان پہ بنا دے گا ۔۔۔ ان کو شوق آرائش دل ہے بدگماں اپنا
دیر و کعبہ یکساں ہے عاشقو نکو اے مومنؔ ۔۔۔ ہو رہے ہیں دھیں کے ہم جی لگا جہاں اپنا

مومنؔ کا کلام ندرت تخیل، نزاکت بیان اور معاملہ بندی کے ساتھ سراسر تغزل کا گنج گرانمایہ

ہے، جس میں انھوں نے اچھوتے اسلوب بیان کے ساتھ عامۃ الورود خیالات عشق و محبت کو جن میں جوش و سرمستی بدرجہ اتم موجود ہے پیش کیا ہے اور باایں ہمہ نزاکت تخیل و ندرت بیان، سوقیت یا ابتذال نام کو نہیں - ان ہی کمالات نے مومن کے تغزل کو ان کے تمام معاصرین خصوصًا غالب سے قرنوں آگے بڑھا دیا اور مرزا باوجود سلامتی فہم قدرت بیان میں وہاں تک نہ پہنچ سکے -

---

اسلام کا اقتصادی نظام

تیسرا ایڈیشن

ندوۃ المصنفین کی اس اہم، مفید، اور مقبول ترین کتاب کا یہ تیسرا ایڈیشن غیر معمولی اضافوں کے بعد وجود میں آیا ہے -

۲۰×۲۶ / ۲۱ سطر مسطر کے باوجود کتاب کا حجم ۴۴۴ صفحات تک پھیل گیا ہے اس دفعہ خصوصیت کے ساتھ اسلامی معاشیات کے مفکرین خاص حافظ ابن حزم اندلسیؒ، امام غزالیؒ، امام رازیؒ، حافظ ابن قیمؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے اُن نظریوں کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے جو ان حضرات نے قرآن و سنت کی روشنی میں خالص معاشی اور اقتصادی نقطۂ نظر سے پیش فرمائے ہیں اسی کے ساتھ موجودہ سرمایہ دارانہ معاشی نظام کی راس و اساس مسئلہ سود پر بھی سیر حاصل بحث کی گئی ہے حک و فک، حذف و اضافہ اور بہت سی دیگر خصوصیتوں کی وجہ سے اس کتاب کی حیثیت ایک جدید تالیف کی ہو گئی ہے۔ اسی لئے اسے مطبوعات ندوۃ المصنفین ۴۵ء کے سلسلہ میں رکھا گیا ہے چند نسخے ضائع ہونے سے بچ گئے۔ قیمت غیر مجلد للعہ مجلد عہ

مکتبہ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی